OPEN ACCESS: Al Khadim Research Journal of Islamic Culture and Civilization
ISSN (ONLINE): 2710-0235 & ISSN (PRINT): 2710-0227
http://www.arjish.com

The Concept of "Arabi-i Mu'alla" and the Restriction to the Quraish Dialect in Exegesis: A Historical and Linguistic Evaluation of Javed Ahmad Ghamidi's Viewpoint

اصولِ تفسیر میں "عربیِ معلیٰ" اور تخصیصِ لغتِ قریش: جاوید احمد غامدی کی رائے کا تاریخی و لسانی نقد

Muhammad Babar Zeb
Ph.D Scholar, Department of Islamic and Religious Studies, Hazara University, Mansehra, KPK, Pakistan
zebbabar467@gmail.com

Dr. Muhammad Ibrahim
Assistant Professor, Department of Islamic and Religious Studies, Hazara University, Mansehra, KPK, Pakistan
ibrahim.pak@hu.edu.pk

Received on: 22-10-2025 Accepted on: 24-11-2025

Abstract

This research article critically evaluates the hermeneutical framework proposed by contemporary Muslim thinker Javed Ahmad Ghamidi regarding the linguistic foundation of Qur'anic exegesis. Ghamidi posits that the Qur'an was revealed exclusively in "Arabi-i Mu'alla"—the high classical Arabic dialect of the Quraish tribe in Makkah—and asserts that pre-Islamic Arabic poetry (Adab Jahili) serves as the primary and supreme linguistic criterion for determining the Qur'anic intent. Utilizing a descriptive, analytical, and critical methodology, this study examines Ghamidi's assertions against classical exegesis (Usul al-Tafsir), pre-Islamic poetry classifications, historical linguistics, and authentic Hadith traditions. The investigation reveals that restricting the language of the Qur'an strictly to the dialect of Quraish overlooks the extensive dialectal and tribal diversity of ancient Arabia, which comprised both Adnani and Qahtani branches. Historical analysis of pre-Islamic poetry, drawing upon Ibn Sallam al-Jumahi's Tabqat Fuhul al-Shu'ara' and Dr. Jawad Ali's Al-Mufassal, demonstrates that the highest registers of pre-Islamic poetry belonged primarily to non-Quraishi bedouin tribes rather than the urban mercantile society of Makkah. Furthermore, textual evidence from classical works such as Ismail bin 'Amir's Kitab al-Lughat fi al-Qur'an and Jalal al-Din al-Suyuti's Al-Itqan confirms the substantial presence of non-Quraishi tribal vocabulary within the Qur'an. The study also highlights a methodological asymmetry in Ghamidi's framework, which downgrades Hadith due to Riwayah bi al-Ma'na while granting supreme hermeneutical authority to pre-Islamic poetry despite its historical transmission vulnerabilities. The article concludes that the Qur'an represents a universal Arabic register (Lingua Franca) incorporating the finest linguistic features of multiple Arab tribes, rather than a dialect restricted exclusively to Quraish.

Keywords: Javed Ahmad Ghamidi, Principles of Qur'anic Exegesis, Arabi-i Mu'alla, Dialect of Quraish, Pre-Islamic Arabic Poetry, Dialectal Diversity, Sab'ah Ahruf, Historical Linguistics.

تمہید

قرآنِ کریم انسانیت کی ہدایت کے لیے نازل ہونے والا آخری الٰہی صحیفہ ہے، جس کی تفہیم و تعبیر علومِ اسلامیہ کا بنیادی ترین محور ہے۔ نصوصِ قرآنی سے احکام و معارف کا اخذ و استنباط ایک زندہ اور حرکی تعبیراتی عمل ہے، تاہم اس علمی سفر کی صحت اور صیانت کا تمام تر انحصار ان منہاجی اصولوں اور قواعدِ انضباط پر ہے جنہیں "اصولِ تفسیر" کہا جاتا ہے۔ اسلافِ امت اور ائمہ سلف نے لغتِ عرب، اسالیبِ بیان، سنتِ نبوی اور تعاملِ صحابہ کی روشنی میں تفہیمِ قرآن کے لیے جو ضوابط مدون کیے، وہ قرآنی فکر کو خود ساختہ تاویلات سے محفوظ رکھنے کا بنیادی ذریعہ ثابت ہوئے۔

معاصر دور میں اسلامی فکر کی تجدید اور اصولِ تفسیر کی ازسرِ نو تدوین کے حوالے سے مختلف فکری رجحانات سامنے آئے ہیں۔ ان شخصیات میں ایک نمایاں اور مباحثہ انگیز نام معاصر پاکستانی مفکر جاوید احمد غامدی کا ہے، جنہوں نے

اپنے مخصوص فکری سانچے میں اصولِ تفسیر اور مبادیِ تدبرِ قرآن کا ایک نیا خاکہ پیش کیا ہے۔ غامدی صاحب کے تعبیراتی نظام کی بنیادی عمارت تفہیمِ قرآن کے لیے "لسانِ عرب" اور بالخصوص "عربِیِ معلیٰ" کی حاکمیت پر استوار ہے۔ ان کا بنیادی دعویٰ یہ ہے کہ قرآنِ مجید محض اس زبان میں نازل ہوا ہے جو نزول کے وقت امّ القریٰ (مکہ) میں قبیلۂ قریش کے ہاں بول چال میں مستعمل تھی اور جسے وہ "عربِیِ معلیٰ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس فکری مقدمے کی بنیاد پر وہ جاہلی ادب (الشعر الجاہلی) کو فہمِ قرآن کا سب سے حاکم اور بنیادی ذریعہ قرار دیتے ہیں، جبکہ دوسری طرف احادیثِ نبویہ اور آثارِ صحابہ کی لغوی حجیت کو "روایت بالمعنیٰ" کے عذر کی بنا پر ثانوی یا کمزور درجہ دیتے ہیں۔

مسئلہ تحقیق

جاوید احمد غامدی صاحب کا قرآن مجید کی زبان کو صرف "لسانِ قریش" میں محصور کرنا اور اسے "عربِیِ معلیٰ" کا واحد مصداق ٹھہرانا ایک ایسا اصولی اور تعبیری دعویٰ ہے جو نہ صرف روایتی اصولِ تفسیر سے تصادم رکھتا ہے، بلکہ لغوی، تاریخی، اور تدوینی شواہد کی روشنی میں بھی گھرے سوالات کو جنم دیتا ہے۔ کیا نزولِ قرآن کے وقت عربی زبان کسی ایک جغرافیائی خطے یا قبیلے (قریش) تک محدود تھی؟ کیا جاہلی شاعری کے اعلیٰ ترین نمونے (سبعہ معلقات) قریشی شعراء کے تخلیق کردہ ہیں؟ اور کیا قرآن میں غیر قریشی قبائل کے الفاظ اور لہجوں کی موجودگی اس تخصیص کے دعوے کو باطل نہیں کرتی؟

تحقیقی سوال

کیا جاوید احمد غامدی کا قرآنِ مجید کو صرف قریش کی مخصوص زبان ("عربِیِ معلیٰ") میں محصور کرنے کا دعویٰ لغوی، تاریخی، اور روایتی شواہد کی روشنی میں علمی و اصولی طور پر درست ثابت ہوتا ہے؟

اہمیتِ تحقیق اور تحقیقی خلا:

اگرچہ غامدی صاحب کے دینی و فکری افکار پر مختلف زاویائے نگاہ سے تنقیدی کام سامنے آ چکا ہے، لیکن ان کے فکری نظام کی بنیادی اساس—یعنی "مبادیِ تدبرِ قرآن" میں لسانِ عرب کی تخصیص اور "عربِیِ معلیٰ" کے نظریے—کا لغوی تاریخ، طبقاتِ شعراء، اور کثیر القبائلی تمدنی شواہد کی روشنی میں ایک مستقل اور منظم تنقیدی محاکمہ تشنہ بیاں تھا۔ پیشِ نظر تحقیق اس تحقیقی خلا کو پر کرتی ہے اور ابن سلام الجمحی کی **طبقات فحول الشعراء**، ڈاکٹر جواد علی کی **المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام**، اور اسماعیل بن عامر کی کتاب **اللغات فی القرآن** جیسے بنیادی تاریخی و لغوی مصادر کی روشنی میں اس دعوے کی علمی قدر و قیمت متعین کرتی ہے۔

سابقہ تحقیقی کام کا جائزہ

قرآنِ مجید کی لغوی حقیقت، جاہلی شاعری کی حجیت، اور جاوید احمد غامدی کے تفسیری افکار پر کلاسیکی و معاصر ادوار میں گراں قدر علمی کام سامنے آ چکا ہے، جن کا تنقیدی مطالعہ اس تحقیق کی علمی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

کلاسیکی ذخیرۂ علوم میں ائمہ سلف نے قرآن کی لغوی وسعت اور قبائلی لغات کے باہمی اختلاط پر تفصیلی بحث کی ہے۔ امام ابو عبیدہ معمر بن المثنیٰ (م ۲۰۹ھ) نے اپنی تصنیف **مجاز القرآن** میں کلامِ عرب کے ذریعے قرآنی الفاظ کی لغوی تشریح کا منہج واضح کیا۔

[i] امام ابن جریر الطبری (م ۳۱۰ھ) نے اپنی عظمیٰ تفسیر **جامع البيان عن تأويل آي القرآن** میں ثابت کیا کہ اگرچہ قرآن کی بنیادی زبان عربی ہے، مگر اس میں عرب کے تمام فصیح قبائل کے اسالیب شامل ہیں۔[ii] امام جلال الدین السیوطی (م ۹۱۱ھ) نے **الإتقان في علوم القرآن** میں صحابیِ رسول حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے طریق سے وہ تمام لغوی شواہد یکجا کیے جو قرآن میں قریش کے علاوہ دیگر قبائل (ہذیل، حمیر، تمیم، کنانہ) کی زبان کے وجود کو ثابت کرتے ہیں۔[iii]

تاریخِ لغت اور شعرِ جاہلی کی پرکھ کے سلسلے میں امام محمد بن سلام الجمحی (م ۲۳۲ھ) کی **تصنیف طبقات فحول الشعراء** ایک محوری مرجع ہے۔ موصوف نے عرب کے دس طبقاتِ شعراء کی درجہ بندی کرتے ہوئے یہ تاریخی حقیقت واضح کی کہ پہلے درجے کے فحول شعراء کا تعلق قریش سے نہیں بلکہ بدوی قبائل سے تھا۔[iv] معاصر دور میں جدید مؤرخ اور ماہرِ لسانیات ڈاکٹر جواد علی نے اپنی تصنیف **المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام** میں قدیم عربی زبان کے لہجوں اور قبائلی فصاحت کا گہرا تاریخی تجزیہ پیش کیا اور ثابت کیا کہ مکہ کی تجارتی زندگی کی وجہ سے قریش کی زبان میں عجمی اثرات داخل ہو چکے تھے، جبکہ حقیقی بدوی فصاحت بنو تمیم، بنو قیس اور بنو اسد کے ہاں محفوظ تھی۔[v]

معاصر اسلامی فکر میں جاوید احمد غامدی کے افکار پر بھی تنقیدی ادبیات مرتب ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر حافظ محمد زبیر نے اپنی کتاب **فکرِ غامدی: ایک تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ** میں غامدی صاحب کے فہمِ قرآن کے اصولوں کا عمومی جائزہ لیا ہے۔[vi] ڈاکٹر محمد قاسم فکتو نے **غامدی نظریات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ** میں غامدی صاحب کے اجتہادی اصولوں پر نقد کیا ہے۔[vii] اسی طرح عبدالوکیل ناصر نے **اصولِ اصلاحی اور اصولِ غامدی کا تحقیقی جائزہ** میں مولانا امین احسن اصلاحی اور جاوید احمد غامدی کے فہمِ قرآن کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔[viii]

تحقیقی خلا کا تعین:

مذکورہ بالا تمام ادبیات کا تجزیہ ظاہر کرتا ہے کہ اگرچہ غامدی فکر پر عمومی تنقید موجود ہے، لیکن غامدی صاحب کے پیش کردہ اصول "عربیِ معلیٰ" کا خود ان کے اپنے مانے ہوئے مصادر (سبعہ معلقات اور جاہلی شعراء) کی نسلی و قبائلی تاریخ سے تضاد، اور ڈاکٹر جواد علی و ابن سلام الجمحی کے لغوی ڈیٹا کی روشنی میں محاکمہ ایک مستقل موضوع کے طور پر تشنہ تھا۔ پیشِ نظر مقالہ اسی علمی خلا کو پر کرتا ہے۔

نظریاتی و منہاجی فریم ورک

اس تحقیق کا نظریاتی فریم ورک "اصولِ تفسیر" اور "تاریخی لسانیات" کے باہمی امتزاج پر قائم ہے۔

اصطلاحی تعریفات:

- **عربیِ معلیٰ:** غامدی صاحب کی اصطلاح میں اس سے مراد امّ القریٰ (مکہ) میں قبیلۂ قریش کی وہ فصیح اور بلیغ زبان ہے جو نزولِ قرآن کے وقت ان کا روزمرہ محاورہ تھی۔[ix]
- **حجتِ لسان:** ائمہ سلف کے ہاں لغتِ عرب قرآن کے غریب الفاظ اور اسالیب کو سمجھنے کا ثانوی اور خادم ماخذ ہے، جبکہ غامدی منہج میں یہ تفسیری مآخذ کی ترتیب میں حاکمِ اول کا درجہ رکھتی ہے۔

منہاجِ تحقیق:

تحقیق میں توصیفی و تحلیلی (Analytical & Descriptive) اور ناقدانہ (Critical) اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔

- **بنیادی مصادر:** غامدی صاحب کے موقف کی تفہیم کے لیے ان کی بنیادی کتب میزان اور برہان کو استعمال کیا گیا ہے۔
- **ثانوی و روایتی مصادر:** لغوی و تاریخی نقد کے لیے **طبقات فحول الشعراء** (ابن سلام الجمحی)، **المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام** (ڈاکٹر جواد علی)، **الاتقان** (سیوطی)، **جامع البیان** (طبری)، اور **کتاب اللغات فی القرآن** (اسماعیل بن عامر) پر اعتماد کیا گیا ہے۔
- **استدلال کا ترازو:** غامدی صاحب کے استدلال کی داخلی منطق کا مقابلہ متواتر تاریخی نصوص، احادیثِ نبویہ، اور لغوی حقائق سے کیا گیا ہے۔

جاوید احمد غامدی کا تصورِ "عربیِ معلیٰ" اور تخصیصِ لغتِ قریش: فکری استدلال کا تجزیہ

جاوید احمد غامدی صاحب کے تفسیری نظام کا سب سے پہلا اور محوری ستون "عربیِ معلیٰ" کی فہم ہے۔ وہ اس بات پر سخت اصرار کرتے ہیں کہ قرآنِ مجید کو سمجھنے کے لیے کسی خارجی روایت یا بعد کے ادوار کی فقہی تاویلات کے بجائے، محض نزولِ قرآن کے عہد کی زبان پر تکیہ کیا جانا چاہیے۔

غامدی صاحب کا بنیادی موقف:

غامدی صاحب اپنی معرکہ آرا تصنیف **میزان** میں اس اصول کو متعین کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"پہلی چیز یہ ہے کہ قرآن جس زبان میں نازل ہوا وہ ام القریٰ کی عربی معلیٰ ہے جو اس کے دور جاہلیت میں قبیلہ قریش کے لوگ اس میں بولتے تھے اس میں شبہ نہیں کہ اس کو اللہ تعالی نے اپنی اس کتاب میں فصاحت کا ایک لافانی معجزہ بنا دیا لیکن اپنی اصل کے اعتبار سے یہ وہی زبان ہے جو خدا کا پیغمبر بولتا تھا اور جو اس زمانے میں اہلِ مکہ کی زبان تھی۔ اس لیے اس کتاب کا فہم اب اس زبان کے صحیح علم اور اس کے صحیح ذوق ہی پر منحصر ہے اور اس میں تدبر اور اس کی شرح اور تفسیر کے لیے یہ ضروری ہے کہ آدمی اس زبان کا جید عالم اور اس کے اسالیب کا ایسا ذوق آشنا ہو کہ قرآن کے مدعا تک پہنچنے میں کم سے کم اُس کی زبان اُس کے راہ میں حائل نہ ہو سکے۔"[x]

جاہلی ادب کا معیار اور استشہاد:

غامدی صاحب کے نزدیک ہر زبان کا حقیقی فکری اور لسانی معیار اس کے اعلیٰ لٹریچر (ادب) سے قائم ہوتا ہے۔ ان کا موقف ہے کہ جس طرح اردو میں غالب و اقبال اور عربی میں خطابتِ سلف کو معیار مانا جاتا ہے، بالکل اسی طرح قرآنِ مجید کے استعارات، محاورات اور اسالیب کو ان کے اصل ڈھانچے میں سمجھنے کے لیے عرب کے جاہلی ادب **(الأدب الجاہلي)** سے رجوع کرنا لازم ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں:

"اس کے بعد اس زبان کا سب سے بڑا ماخذ کلام عرب ہے... اس میں شبہ نہیں کہ لغت عرب کا جو ذخیرہ اس طرح متواتر نہیں ہے، اس کی تحقیق کے لیے سب سے زیادہ مستند ماخذ یہی کلام عرب ہے۔ اگرچہ اس میں کچھ منحول کلام بھی شامل ہے لیکن جس طرح نقدِ حدیث کے علماء اس کی صحیح اور سقیم روایتوں میں امتیاز کر سکتے ہیں، اس طرح اس کلام کے نقاد روایت اور درایت کے نہایت واضح معیارات کی بنا پر اس کے خالص اور منحول کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دے سکتے ہیں۔"[xi]

غامدی صاحب کا استدلالِ قرآنی:

غامدی صاحب تخصیصِ لغتِ قریش پر اپنا فکری استدلال قائم کرنے کے لیے سورہ مریم کی درج ذیل آیتِ کریمہ کو بطورِ نص پیش کرتے ہیں:

﴿لُدًّا قَوْمًا بِهِ وَتُنْذِرَ الْمُتَّقِينَ بِهِ لِتُبَشِّرَ بِلِسَانِكَ يَسَّرْنَاهُ فَإِنَّمَا﴾

ترجمہ: "پس ہم نے اس قرآن کو آپ کی زبان میں آسان کر دیا تاکہ آپ اس کے ذریعے پرہیزگاروں کو خوشخبری دیں اور ضدی قوم کو ڈرا دیں۔"[xii]

غامدی صاحب کے نزدیک اس آیت میں **بِلِسَانِكَ** (آپ کی زبان میں) کے الفاظ اس بات کی قطعی دلیل ہیں کہ قرآن کا لسانی قالب صرف اور صرف نبی اکرم ﷺ کی ذاتی زبان، یعنی قبیلۂ قریش اور اہلِ مکہ کی عربی تک محدود ہے۔[xiii]

تخصیصِ لغتِ قریش کا تاریخی، لغوی اور تدوینی ابطال

غامدی صاحب کا یہ قائم کردہ مقدمہ کہ قرآنِ مجید کی زبان صرف مکہ کے قریشی ماحول تک محصور تھی، جب نصوصِ قرآنی، تاریخی شواہد اور لغوی حقائق کے ترازو میں تولا جاتا ہے تو اس کا بطلان واضح ہو جاتا ہے۔

الف) قرآنی عموم بمقابلہ قریشی تخصیص

قرآنِ مجید نے اپنے لسانی تشخص کو بیان کرتے وقت کسی ایک مقام پر بھی خود کو "لسانِ قریشی" کی طرف منسوب نہیں کیا، بلکہ ہر جگہ مطلق "عربی" کی طرف نسبت کی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

- ﴿يَتَّقُونَ لَعَلَّهُمْ عِوَجٍ ذِي غَيْرَ عَرَبِيًّا قُرْآنًا﴾[xiv]
- ﴿يَعْلَمُونَ لِقَوْمٍ عَرَبِيًّا قُرْآنًا آيَاتُهُ فُصِّلَتْ كِتَابٌ﴾[xv]
- ﴿مُبِينٍ عَرَبِيٍّ بِلِسَانٍ ۞ الْمُنْذِرِينَ مِنَ لِتَكُونَ قَلْبِكَ عَلَى ۞ الْأَمِينُ الرُّوحُ بِهِ نَزَلَ﴾[xvi]

امام محمد بن ادریس الشافعی (م ۲۰۴ھ) نے اپنی معرکہ آرا تصنیف **الرسالة** میں یہ اصولی قاعدہ واضح فرمایا ہے کہ "لسانِ عرب" اپنے دائرۂ کار اور وسعت میں اتنی وسیع ہے کہ کسی ایک فرد یا کسی ایک قبیلے کے لیے اس کے تمام اسالیب کا احاطہ کرنا ممکن نہیں، اور قرآن اس پوری جامع لغتِ عرب کا حامل ہے، نہ کہ کسی ایک قبیلے کا محصور نسخہ۔[xvii]

ب) غامدی صاحب کے استدلالِ آیتِ بِلِسَانِكَ پر تنقیدی نقد

غامدی صاحب کا آیت **فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ** سے یہ نتیجہ نچوڑنا کہ قرآن کا لسانی دائرہ صرف لغتِ قریش ہے، متنِ آیت کے عمومی سیاق کے خلاف ہے۔ ائمہ اصولِ تفسیر نے وضاحت کی ہے کہ یہاں "تیسیرِ لسان" سے مراد دعوت و تبیین کی سہولت ہے، نہ کہ دیگر عرب قبائل کے فصیح لہجوں کی نفی کرنا۔
امام ابن جریر الطبری اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ **بِلِسَانِكَ** سے مراد مجموعی طور پر عربوں کی لغتِ فصحیٰ ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی لسان عربیتِ عامہ کی نمائندہ تھی، نہ کہ کسی جغرافیائی تحدید کی اسیر۔[xviii]

ج) رسالت کا آفاقی دائرہ اور "قومیتِ دعوت"

شریعتِ اسلامیہ کے مسلمہ اصولوں کی رو سے رسولِ اکرم ﷺ کی بعثت کسی مخصوص جغرافیائی طبقے یا قبیلے (قریش) تک محدود نہیں تھی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:
وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ ۔[xix]
اگر قرآنِ کریم کے اس قاعدے کو تسلیم کیا جائے کہ ہر نبی اپنی قوم کی زبان میں بھیجا گیا (**بِلِسَانِ قَوْمِهِ**)، تو نبی اکرم ﷺ کی "قوم" صرف مکہ کے چند قریشی تاجر نہیں تھے، بلکہ اس کا اولین دائرہ پورے جزیرہ نما عرب کے تمام قحطانی و عدنانی قبائل کو محیط تھا۔[xx] لہٰذا، قرآن کی زبان مجموعی لغتِ عرب ہے، جس میں اگر قریش کا رنگ غالب ہے تو وہ محض ایک تمدنی مرکزیت کی بنا پر ہے، حصر و تحدید کے طور پر نہیں۔

بائلی و لسانی تنوع، سبعہ معلقات اور طبقاتِ شعراء کا تحقیقی محاکمہ

غامدی صاحب کے نظریے پر سب سے بڑا فنی اور تاریخی اشکال خود ان کے مانے ہوئے بنیادی لغوی مصادر یعنی "الشعر الجاہلی" اور "سبعہ معلقات" کے تجزیے سے سامنے آتا ہے۔

سبعہ معلقات کے شعراء اور ان کے قبائلی انساب

نمبر شمار	شاعر کا نام	قبیلہ/نسب	جغرافیائی و نسلی خطہ	قریشی / غیر قریشی
1.	امرؤ القیس بن حجر	کِندہ (قحطانی)	جنوبی عرب (یمن)	غیر قریشی
2.	النابغہ الذبیانی	بنو ذبیان (مضر)	نجد/ شمالی عرب	غیر قریشی
3.	زہیر بن ابی سلمیٰ	مزینہ (مضر)	شمالی عرب	غیر قریشی
4.	الأعشی (میمون بن قیس)	بنو ضبیعہ (ربیعہ)	الیمامہ / نجد	غیر قریشی
5.	طرفہ بن العبد	بنو بکل / ربیعہ	البحرین / نجد	غیر قریشی
6.	لبید بن ربیعہ العامری	بنو عامر بن صعصعہ	نجد	غیر قریشی
7.	عمرو بن کلثوم	تغلب (ربیعہ)	شمالی عرب / فرات	غیر قریشی

الف) سبعہ معلقات اور لغتِ قریش کا تضاد

غامدی صاحب کا مقدمہ ہے کہ فہمِ قرآن کے لیے جاہلی ادب کا سب سے اعلیٰ نمونہ "سبعہ معلقات" اور دواوینِ عرب ہیں۔[xxi] لیکن تاریخی حقیقت یہ ہے کہ ان تمام فحول شعراء میں **کوئی ایک شاعر بھی قبیلۂ قریش سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔**
جیسا کہ درج بالا جدول سے عیاں ہے، امرؤ القیس کا تعلق یمن کے قحطانی قبیلے "کِندہ" سے تھا،النابغہ الذبیانی بنو ذبیان سے تھے، الأعشی بنو ضبیعہ سے تھے، اور عمرو بن کلثوم کا تعلق تغلب سے تھا۔[xxii] اب اگر قرآن صرف قریش کی زبان میں نازل ہوا تھا، تو غامدی صاحب کے نزدیک فہمِ قرآن کا جو سب سے بڑا لغوی سرچشمہ (جاہلی شاعری) ہے، اس میں قریش کا کوئی نمائندہ ہی موجود نہیں! یہ ایک ایسا گہرا داخلی تضاد ہے جو غامدی صاحب کے اصولی ڈھانچے کو متزلزل کر دیتا ہے۔

ب) ابن سلام الجمحی کی طبقات فحول الشعراء کی شہادت

جب چوتھی صدی ہجری کے نامور نقادِ ادب امام محمد بن سلام الجمحی (م ۲۳۲ھ) نے جاہلی شعراء کے فنی طبقات مرتب کیے، تو انہوں نے اپنی معرکہ آرا تصنیف **طبقات فحول الشعراء** میں عرب کے شعراء کے دس طبقات قائم کیے۔ ان طبقات میں **پہلے طبقے کے فحول (اعلیٰ ترین شعراء) میں قریش کے کسی ایک شاعر کو بھی اس لائق نہیں سمجھا گیا کہ اسے شامل کیا جا سکے۔**[xxiii]

ابن سلام الجمحی لکھتے ہیں کہ پہلے طبقے کے شعراء (امرؤ القیس، النابغہ، زہیر، الاعشیٰ) سب کے سب نجد، یمن اور ربیعہ و مضر کے بدوی قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔[xxiv] قریش کے ہاں جاہلی دور میں کوئی ایسی عظیم شعری روایت موجود نہ تھی جسے لغوی قواعد کے لیے "ماخذِ اول" مانا جا سکے۔ قریش میں جو شعراء ملتے ہیں (جیسے ابو طالب)، ان کا ذکر خاندانی و تاریخی نسبت سے ہے، فنی و لغوی برتری کی بنا پر نہیں۔[xxv]

ج) فصاحتِ عرب اور قریش: ڈاکٹر جواد علی کی تاریخی تحقیق

معاصر دور کے مایہ ناز مؤرخ ڈاکٹر جواد علی نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف **المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام کی** ساتویں جلد میں اس سوال پر تفصیلی جرح کی ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت حقیقی "فصیح عربی" کن قبائل کے ہاں پائی جاتی تھی؟

ڈاکٹر جواد علی کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ قریش کو مطلقاً "افصح العرب" (عربوں میں سب سے فصیح) کہنا تاریخی حقائق کے منافی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مکہ ایک بین الاقوامی تجارتی مرکز تھا، جہاں حبشہ، روم، اور فارس کے تاجروں کا مسلسل اختلاط رہتا تھا۔ اس اختلاط کے نتیجے میں مکہ کی شہری بولی میں غیر عربی اثرات شامل ہو چکے تھے اور وہ اپنی اصل بدوی فصاحت کھو چکی تھی۔[xxvi]

ڈاکٹر جواد علی کے مطابق، فصاحتِ لسان کے حقیقی مصادر درج ذیل تین بدوی قبائل تھے:

۱۔ بنو تمیم

۲۔ بنو قیس

۳۔ بنو اسد

انہوں نے ثابت کیا کہ بعد کے ادوار میں جب ائمہ لغت (خلیل بن احمد الفراہیدی، ابو منصور الازہری، ابن درید) نے لغتِ عرب کو مدون کیا، تو انہوں نے لغوی قواعد اور شواہد کی بنیاد قریش کی بولی پر نہیں، بلکہ **بنو تمیم، بنو قیس اور بنو اسد** کی زبان پر رکھی۔[xxvii]

قریش کی اس لسانی احتیاج کا سب سے بڑا تاریخی ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کی زبان کی فصاحت برقرار رکھنے کے لیے انہیں شیرخوارگی کے زمانے میں مکہ کے شہری ماحول سے دور، دیہاتی قبائل (جیسے بنو سعد) کے سپرد کر دیتے تھے، جیسا کہ خود نبی کریم ﷺ کی پرورش بنو سعد میں ہوئی۔[xxviii] اگر قریش کی زبان خود اعلیٰ ترین "عربیِ معلیٰ" ہوتی، تو انہیں اپنے بچوں کو صحرا کے بدوی قبائل میں بھیجنے کی حاجت پیش نہ آتی۔

احادیثِ احرفِ سبعہ اور غیر قریشی لغات کا ثبوت

غامدی صاحب کے تخصیصِ قریش کے نظریے کا سب سے محکم رد احادیثِ متواترہ اور قرآنی متن میں موجود غیر قریشی لغوی الفاظ سے ہوتا ہے۔

الف) حدیثِ احرفِ سبعہ

احادیثِ متواترہ سے یہ بات ثابت ہے کہ قرآنِ مجید کا نزول صرف ایک قبیلے کے لہجے پر نہیں ہوا، بلکہ امت کی آسانی کے لیے اسے مختلف قبائلی لہجوں میں پڑھنے کی الٰہی رخصت دی گئی۔

صحیح بخاری و صحیح مسلم میں سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت ہشام بن حکیم رضی اللہ عنہ کو سورۂ الفرقان ایسے لہجے اور حروف میں پڑھتے سنا جو ان کے لہجے سے مختلف تھا۔ جب وہ انہیں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں لے گئے، تو آپ ﷺ نے دونوں کی قراءت سن کر فرمایا:

"هَكَذَا أُنْزِلَتْ، إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ أُنْزِلَ عَلَى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ، فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ"

ترجمہ: "یہ سورت اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ بے شک یہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے، پس تم اس میں سے اسی طرح پڑھو جو تمہارے لیے آسان ہو۔"[xxix]

یہ متواتر حدیث اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ کلامِ الٰہی کا لسانی سانچہ قریش کے ایک لہجے تک محدود نہیں تھا، بلکہ اس میں عرب کے سات بڑے قبائلی اسالیب کی وسعت موجود تھی۔

ب) اسماعیل بن عامر کی کتاب اللغات فی القرآن کی شہادت

نزولِ قرآن کی کثیر القبائل لسانی ساخت پر سب سے مضبوط دستاویزی شہادت چوتھی صدی ہجری کے نامور امام اسماعیل بن عامر (م ۳۵۴ھ) کی تصنیف **كِتَابُ اللُّغَاتِ فِي الْقُرْآنِ** سے ملتی ہے۔ موصوف نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مسند روایات نقل کر کے قرآنِ مجید کے ان الفاظ کی فہرست مرتب کی ہے جو قریش کے علاوہ دیگر قبائل کی زبانوں سے ماخوذ ہیں۔[xxx]

اسماعیل بن عامر کی دستاویزی تفصیل کے مطابق قرآن میں درج ذیل قبائل کی لغات شامل ہیں:

- **قریش:** 104 الفاظ
- **بنو اسرائیل (اہلِ کتاب کے اثرات سے مستعار کلمات):** 45 الفاظ
- **قبیلہ کنانہ:** 36الفاظ
- **قبیلہ ہذیل، تمیم، حِمْیَر (یمن)، اوس، خزرج، غسان، اور ثقیف:** کثیر تعداد میں الفاظ۔[xxxi]

یہ شماریاتی تفاصیل واضح کرتی ہیں کہ قرآنِ مجید میں قریش کے علاوہ دیگر تمام فصیح عرب قبائل کے کلمات اس طرح رچ بس گئے ہیں کہ انہیں لسانِ قرآن سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

ج) غیر عربی (دخیل) الفاظ کا وجود

علاوہ ازیں، ائمہ لغت اور مفسرینِ عظام کے مابین یہ علمی حقیقت مسلم ہے کہ قرآنِ مجید کی جامع لغت میں چند ایسے کلمات بھی پائے جاتے ہیں جو غیر عربی الاصل ہیں، اور جو جاہلی دور کے تجارتی روابط کے نتیجے میں عربی زبان کا حصہ بن چکے تھے۔

- **جَهَنَّمَ:** عبرانی یا فارسی الاصل۔[xxxii]
- **قِسْطَاس:** یونانی الاصل (ترازو) ۔[xxxiii]
- **مِشْكَاة:** حبشی الاصل (طاق) ۔[xxxiv]

یہ تمام شواہد ثابت کرتے ہیں کہ قرآن کی زبان "عربیِ مبین" (جامع و ترقی یافتہ عربی) ہے، نہ کہ قریش مکہ کی کوئی الگ تھلگ، خالص اور محدود بولی۔

حدیث کی "روایت بالمعنیٰ" اور لغوی حجیت پر نقد

جاوید احمد غامدی صاحب نے اپنی کتاب **میزان** میں یہ اصولی موقف اختیار کیا ہے کہ قرآن کی زبان کے بعد "عربیِ معلیٰ" کا دوسرا ماخذ حدیثِ نبوی اور آثارِ صحابہ ہیں، لیکن ساتھ ہی وہ لکھتے ہیں:

> "روایت المعنیٰ (مفہوم کو اپنے الفاظ میں بیان کرنا) کی وجہ سے ان ذخائر کا بہت تھوڑا حصہ ہی ہے جسے اب زبان کی تحقیق میں سند اور حجت کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے..."[xxxv]

تنقیدی محاکمہ

غامدی صاحب کے اس طرزِ استدلال کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں انہوں نے دراصل ایک تسامح اختیار کیا ہے:

۱۔ ایک طرف انہوں نے تسلیم کیا کہ حدیث میں روایت بالمعنیٰ موجود ہے۔

۲۔ دوسری طرف اس روایت بالمعنیٰ کو عذر بنا کر رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی زبان کی لغوی حجیت کو محدود کر دیا، اور اس کے مقابلے میں جاہلی شاعری کو (اس کے تدوینی اختلافات اور طٰہٰ حسین جیسے نقادوں کے پیدا کردہ شکوک کے باوجود) "ماخذِ اول" تسلیم کر لیا۔[xxxvi]

علمائے اصول اور محدثین کے نزدیک غامدی صاحب کا یہ استدلال علمی لحاظ سے شدید کمزور ہے۔ "روایت بالمعنیٰ" کا شرعی اور لغوی مفہوم ہرگز یہ نہیں ہے کہ احادیث کے ذخیرے میں بعد کے عجم یا غیر فصیح لوگوں کے الفاظ شامل ہو گئے ہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ **فصیح وبلیغ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل کو اپنے ہی عہد کے فصیح عربی الفاظ میں بیان کیا ہے۔**[xxxvii]

چونکہ صحابہ کرامؓ کی اپنی زبان بعینہ وہی زبان ہے جس میں قرآنِ مجید نازل ہوا، اس لیے روایت بالمعنیٰ کے باوجود حدیث اور آثارِ صحابہ کی زبان خالص قریشی اور حجازی عربی ہی ہے۔ لٰہذا، احادیثِ نبویہ اور آثارِ صحابہ کو

"عربِی معلیٰ" کے دائرے سے خارج یا ثانوی قرار دینا اور اس کے مقابلے میں جاہلی اشعارِ منحولہ (مشکوک اشعار) پر اعتماد کرنا تفسیری توازن کو متاثر کرتا ہے۔

معاصر علمی و تفسیری مناہج میں اس بحث کی معاصرانہ تطبیق

اصولِ تفسیر میں "عربِی معلیٰ" اور تخصیصِ لغتِ قریش کی یہ بحث محض ایک قدیم لغوی یا نظری نزاع نہیں ہے، بلکہ معاصر دور میں اسلامی فکر، قانون سازی اور تفہیمِ قرآن کے عملی مناہج پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں:

۱۔ تاویلِ نصوص میں لغوی جمود بمقابلہ شرعی اصطلاح:

اگر غامدی صاحب کے منہج کے مطابق قرآنی الفاظ کو صرف جاہلی لغت اور ظاہرِ زبان پر محمول کیا جائے، تو شریعت کی بنیادی اصطلاحات (الصلاة، الزکاة، الحج، الإيمان، الكفر) اپنے ان ارفع شرعی اور نظریاتی مفاہیم سے محروم ہو کر محض جاہلی دور کے مادی معانی (دعا، پاکیزگی، قصد، سکیورٹی) میں محصور ہو کر رہ جاتی ہیں۔ معاصر فقہ میں شارع کی اصطلاحی حد بندی (نبوی تبیین) کو لغتِ جاہلی پر حاکم ماننا ہی شریعت کے قانونی ساخت کو قائم رکھتا ہے۔

۲۔ معاصر تجدد پسندی کا سدِ باب:

معاصر مغرب اور عالمِ اسلام میں جدیدیت پسند مفکرین (مثلاً محمد ارکون، نصر حامد ابو زید) نے قرآن کو ایک "تاریخی و انسانی متن" ثابت کرنے کے لیے یہی مقدمہ قائم کیا کہ قرآن صرف ساتویں صدی کے مکی ماحول کی بولی ہے۔ غامدی صاحب کا قرآن کو صرف قریش کی بولی کہنا غیر ارادی طور پر انہی جدیدیت پسندانہ تاویلات کو تقویت فراہم کرتا ہے۔ اس کے برعکس، جب قرآن کو پوری لغتِ عرب اور آفاقی "لسانِ عربِی مبین" مانا جائے، تو اس کی ابدی اور آفاقی قانون سازی کی معنویت محفوظ رہتی ہے۔

مجموعی تنقیدی و اصولی محاکمہ

اس تمام تر بحث و تمحیص کے بعد جاوید احمد غامدی صاحب کے اصولِ "عربِی معلیٰ" اور تخصیصِ لغتِ قریش کا نقد و نظر کے ترازو میں مجموعی محاکمہ درج ذیل علمی نکات پر قائم ہوتا ہے:

مثبت پہلو:

غامدی صاحب نے تفہیمِ قرآن کے لیے عربی زبان، اسالیبِ بیان اور ادبی ذوق کی اہمیت پر جو زور دیا ہے، وہ بذاتِ خود اصولِ تفسیر کا ایک مستحسن اور جاندار پہلو ہے، جس سے معاصر دور کے لغوی جمود کو توڑنے اور کلامِ الٰہی کے اعجاز کو نکھارنے میں مدد ملتی ہے۔

کمزور پہلو :

- **تخصیصِ قریش کی تاریخی نفی:** قرآن کو صرف قریش کی بولی کہنا تاریخی، لغوی اور نسلی حقائق کے منافی ہے۔ جاہلی شاعری کے اعلیٰ معلقات غیر قریشی بدوی قبائل کی ملکیت تھے اور قریش کے ہاں کوئی برتر شعری نظام موجود نہ تھا۔[xxxviii]
- **احادیث و آثار کی لغوی حیثیت کو گھٹانا:** جاہلی شاعری کے مشکوک (منحول) ذخیرے کو ماخذِ اول بنانا اور اس کے مقابلے میں صاحبِ وحی ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی زبان (حدیث) کو روایت بالمعنیٰ کا عذر بنا کر ثانوی قرار دینا اصولی التباس کا باعث ہے۔
- **تفسیری ترجیحات کا بگاڑ:** جمہورِ امت کے ہاں لغت فہمِ قرآن کا "خادم" ہے، جبکہ غامدی منہج میں لغت کو نصوصِ نبویہ اور اسبابِ نزول پر "حاکم" بنا دیا گیا ہے، جس سے تفسیری توازن متاثر ہوتا ہے۔

حاصلِ تحقیق و نتائج

زیرِ نظر تحقیقی مقالے میں جاوید احمد غامدی صاحب کے اصولِ فہمِ قرآن "عربِی معلیٰ" اور تخصیصِ لغتِ قریش کا جو تفصیلی، لغوی، تاریخی، اور تدوینی جائزہ لیا گیا ہے، اس سے درج ذیل حتمی نتائج اخذ ہوتے ہیں:

۱۔ **نفسِ اصول اور ترجیحات کا فرق:** غامدی صاحب اور جمہورِ سلف کے مابین اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن کو سمجھنے کے لیے لغتِ عرب اور جاہلی لٹریچر سے استشہاد ناگزیر ہے۔ تاہم، بنیادی اختلاف ترجیحات کا ہے؛ غامدی صاحب لغت کو تفسیری مآخذ میں سب سے پہلا اور حاکم اصول مانتے ہیں، جبکہ جمہور کے ہاں تفہیمِ قرآن کی ترتیب میں پہلے قرآن، پھر حدیثِ نبوی و آثارِ صحابہ کا مرتبہ ہے، اور لغت کا مقام ان کے بعد آتا ہے۔[xxxix]

۲۔ **تخصیصِ قریش کا بطلان:** تاریخی اور لسانی تحقیقات (ابن سلام الجمحی اور ڈاکٹر جواد علی) سے ثابت ہے کہ لسانِ قرآن کسی ایک قبیلے (قریش) کے محدود لہجے کی اسیر نہیں تھی، بلکہ وہ پورے جزیرہ نما عرب کی ایک جامع اور مشترکہ زبان تھی جس میں قحطانی، عدنانی اور حجازی تمام فصیح قبائل (تمیم، قیس، اسد، ہذیل، حمیر) کے محاسن شامل تھے۔[xl]

۳۔ **دستاویزی و روایتی شہادتیں:** اسماعیل بن عامر کی **کتاب اللغات فی القرآن**، ابن عباسؓ کی روایات، اور احادیثِ احرفِ سبعہ متواترہ اس بات کا حتمی ثبوت ہیں کہ قرآن میں غیر قریشی قبائل کے کلمات بکثرت موجود ہیں، لٰہذا اسے صرف مکہ کی زبان کہنا سائنسی اعتبار سے غلط ہے۔[xli]

۴۔ **حدیث اور جاہلی ادب کی لغوی حجیت:** جاہلی شاعری کے مقابلے میں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات اور صحابہ کرامؓ کے لغوی بیانات (تفسیر بالماثور) متنِ قرآن کے تہذیبی و لغوی معانی کو متعین کرنے میں زیادہ معتبر، متصل اور مقدم ہیں۔[xlii]

لہٰذا غامدی صاحب کا اصولِ "عربِیِ معلیٰ" لغوی ذوق کی حد تک مستحسن ہونے کے باوجود، تخصیصِ قریش، ردِ حدیثِ لغت، اور جاہلی ادب کی مطلق حاکمیت کے اعتبارات سے علمی طور پر راجح نہیں ہے؛ اور جمہورِ امت کا روایتی تفسیری منہج ہی علمی اعتدال اور متنی تحفظ کا حقیقی ضامن ہے۔

حواشی و حوالہ جات

[i] ابو عبیدہ معمر بن المثنیٰ، *مجاز القرآن*، تحقیق: فواد سزگین (قاہرہ: مکتبۃ الخانجی، ۱۹۶۲ء)، ۱: ۱۲-۸۔

[ii] محمد بن جریر الطبری، *جامع البیان عن تأویل آي القرآن*، تحقیق: عبداللہ بن عبد المحسن ترکی (ریاض: دار عالم الکتب، ۲۰۰۳ء)، ۱: ۲۲-۱۵۔

[iii] جلال الدین السیوطی، *الإتقان في علوم القرآن*، تحقیق: مرکز الدراسات القرآنیة (مدینہ منورہ: مجمع الملك فهد، ۱۴۲۶ھ)، ۲: ۴۲۰-۴۰۵۔

[iv] محمد بن سلام الجمحی، *طبقات فحول الشعراء*، تحقیق: محمود محمد شاکر (جدہ: دار المدنی، ۱۹۷۴ء)، ۱: ۵۲-۴۵۔

[v] جواد علی، *المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام* (بغداد: جامعة بغداد، ۱۹۹۳ء)، ۷: 225-۲۰۵۔

[vi] حافظ محمد زبیر، *فکرِ غامدی: ایک تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ* (لاہور: بیت الحکمت، ۲۰۲۴ء)، ص ۱۱۲-۱۲۵۔

[vii] محمد قاسم فکتو، *غامدی نظریات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ* (لاہور: دار الاندلس، ۲۰۱۵ء)، ص ۹۸-۸۹۔

[viii] عبدالوکیل ناصر، *اصولِ اصلاحی اور اصولِ غامدی کا تحقیقی جائزہ* (لاہور: ادارہ اشاعت قرآن و حدیث، ۲۰۱۸ء)، ص ۱۶۰-۱۴۵۔

[ix] جاوید احمد غامدی، *میزان* (لاہور: المورد، ۲۰۲۱ء)، ص ۲۷-۲۵۔

[x] ایضاً، ص ۲۵۔

[xi] ایضاً، ص ۲۶۔

[xii] القرآن، سورۃ مریم: ۹۷۔

[xiii] جاوید احمد غامدی، *برہان* (لاہور: المورد، ۲۰۲۰ء)، ص ۴۸-۴۵۔

[xiv] القرآن، سورۃ الزمر: ۲۸۔

[xv] القرآن، سورۃ فصلت: ۳۔

[xvi] القرآن، سورۃ الشعراء: ۱۹۵-۱۹۳۔

[xvii] محمد بن ادریس الشافعی، *الرسالة*، تحقیق: احمد محمد شاکر (قاہرہ: مکتبۃ الحلبی، ۱۹۳۸ء)، ص ۴۵-۴۱۔

[xviii] الطبری، *جامع البیان*، ۱۸: ۲۴۵۔

[xix] القرآن، سورۃ سبأ: ۲۸۔

[xx] ابن تیمیہ، *مجموع الفتاوی* (مدینہ منورہ: مجمع الملك فهد، ۱۹۹۵ء)، ۱۹: ۱۱۵-۱۱۰۔

[xxi] غامدی، *میزان*، ص ۲۶۔

[xxii] الجمحی، *طبقات فحول الشعراء*، ۱: ۸۰-۵۵؛ جواد علی، *المفصل*، ۹: ۳۲۵-۳۱۰۔

[xxiii] الجمحی، *طبقات فحول الشعراء*، ۱: ۴۸۔

[xxiv] ایضاً، ۱: ۵۰۔

[xxv] ایضاً، ۱: ۸۲۔

[xxvi] جواد علی، *المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام*، ۷: ۲۱۲-۲۱۰۔

[xxvii] ایضاً، ۷: ۲۲۰-۲۱۵۔

[xxviii] ابن ہشام، *السيرة النبوية*، تحقیق: مصطفی السقا (قاہرہ: مطبعة الحلبی، ۱۹۵۵ء)، ۱: ۱۶۵-۱۶۲۔

[xxix] محمد بن اسماعیل البخاری، *الجامع المسند الصحيح (صحيح البخاري)* (بیروت: دار طوق النجاة، ۱۴۲۲ھ)، کتاب فضائل القرآن، باب انزل القرآن علی سبعة احرف، حدیث: ۴۹۹۲؛ مسلم بن الحجاج، *صحيح مسلم*، حدیث: ۸۱۸۔

[xxx] اسماعیل بن عامر، *كِتَابُ اللُّغَاتِ فِي الْقُرْآنِ*، مخطوط مرتب بحوالہ السیوطی، *الاتقان*، ۲: ۴۱۰۔

[xxxi] ایضاً، ص ۴۵-۱۲؛ السیوطی، *الاتقان*، ۲: ۴۱۸-۴۱۲۔

[xxxii] ابو منصور الازہری، *تہذیب اللغة* (بیروت: دار احیاء التراث العربی، ۲۰۰۱ء)، ۶: ۲۳۴۔

[xxxiii] ابن درید، *جمهرة اللغة* (بیروت: دار العلم للملايين، ۱۹۸۷ء)، ۲: ۱۸۰۔

[xxxiv] السیوطی، *الإتقان في علوم القرآن*، ۲: ۴۲۵۔

[xxxv] غامدی، *میزان*، ص ۲۷۔

[xxxvi] طٰہٰ حسین، *في الشعر الجاهلي* (قاہرہ: دار المعارف، ۱۹۲۶ء)، ص ۷۵-۶۵۔

[xxxvii] ابن الصلاح، *معرفة أنواع علم الحديث (مقدمة ابن الصلاح)* (دمشق: دار الفکر، ۱۹۸۶ء)، ص ۲۱۵-۲۱۰۔

[xxxviii] الجمحی، *طبقات فحول الشعراء*، ۱: ۵۲۔

[xxxix] بن کثیر، *تفسير القرآن العظيم* (ریاض: دار طيبة، ۱۹۹۹ء)، ۱: ۱۰-۷۔

[xl] جواد علی، *المفصل*، ۷: ۲۲۵۔

[xli] اسماعیل بن عامر، *كِتَابُ اللُّغَاتِ فِي الْقُرْآنِ*، ص ۵۰۔

[xlii] الشافعی، *الرسالة*، ص ۸۰-۷۵۔